اُردو ادب میں تہذیب وثقافت کی نمائندگی

ڈاکٹر ممتاز کلیانی* ڈاکٹر محمد ساجد خان**

Abstract:

This paper is about the significance of culture and civilization in literature. In the first part of the article authors discuss the definitions of culture and civilization briefly but comprehensively. After this the paper brings out the importance of culture in literature. Then there are vivid examples of cultural depiction and presentation from urdu literature, prose as well as poetry, from ancient to modern times. The paper concludes that no piece of living art can be created without having a flavour of culture.

اُردو ادب میں برصغیر پاک و ہند کی تہذیب وثقافت کی نمائندگی پر بات کرنے سے قبل ضروری ہوگا کہ ہم یہ جانیں کہ تہذیب وثقافت سے کیا مراد ہے۔

کلچر کا مقبول ترین اُردو ترجمہ ثقافت ہے۔ تہذیب کا لفظ بھی ثقافت کا ہم معنی تصور کیا جاتا ہے۔ ثقافت کا مادہ ث ق ف سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی پالینا، سیدھا کرنا وغیرہ کے ہیں۔ ڈاکٹر فاروق عثمان تہذیب وثقافت کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ثقافت کا مفہوم ذہنی اور فکری صلاحیتوں پر محیط ہے اور تہذیب کا لفظ انداز واطوار کی شائستگی اور پاکیزگی کو ظاہر کرتا ہے اور اس طرح دونوں مل کر ایک ایسے انسان کا تصور پیش کرتے ہیں جو آداب و معاشرت کے ساتھ ساتھ علوم و فنون میں بھی زیرک و دانا ہو۔ جب اس مفہوم کو فرد سے ہٹ کر پورے معاشرے کے لیے استعمال کریں گے تو مراد ایسا معاشرہ ہوگا جو اطوار و انداز کے ساتھ ساتھ علوم وفنون میں بھی ترقی ومہارت رکھتا ہو۔''[۱]

گویا کلچر سے مراد انفرادی و اجتماعی، ذوقی وخلاقی اور معاشرتی رویے اور اجتماعی عادات جب کہ وسیع تر معنوں میں اس میں فنون بھی شامل ہوں گے اور علوم وآداب واخلاق بھی۔

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

ایک اور لفظ جو کلچر کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے تمدن ہے۔ یہاں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ایک چھوٹا سا فرق تمدن اور ثقافت کا بیان کر دیا جائے۔ ثقافت کے آسان معنی طرزِ زندگی جو کسی قانونی جبر کے بغیر، رضا کارانہ معاشرے کے سب افراد میں ایک جیسی ہو، جس سے زندگی زیادہ بامعنی اور پُر راحت بن جاتی ہو جب کہ وہ مظاہر جو کسی جبری و قانونی تنظیم یا منصوبہ بندی سے اُبھرتے ہیں تمدن کہلاتے ہیں۔ تمدن میں قانون، ارادت و تنظیمات شامل ہیں۔ تمدن مکمل شہری زندگی کا کمال ہے یہ انگریزی کے لفظ سویلائزیشن (Civilization) کا مترادف ہے اور تہذیب کے مقابلے میں وسیع تر لفظ ہے۔

اس کلچر میں فنون و تفریحات، آداب، انفرادی و مجلسی اور ذوقیات کی دوسری شکلیں شامل ہیں جو جبری نہیں۔ اس طرح بنظرِ غور اس کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ دراصل تہذیب و ثقافت کسی معاشرے کے افراد یا کسی اجتماع کے ان متواتر اور عادی رویوں کا نام ہے جن کا سرچشمہ وراثت یا نسلِ انسانی کی کسی جبلت سے نہیں ہے بلکہ کسی اجتماع نے خاص ماحول میں خاص عقائد و افکار اور دوسرے اثرات کے تحت انہیں اپنے اندر پیدا کر لیا اور ان میں یک رنگی پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ثقافت کا عمل کم و بیش ایک اجتماعی عمل ہے یعنی ایسا عمل ہے جس میں ایک اجتماع کے اکثر افراد مشترک رویہ اختیار کرتے ہیں اور اس رویے میں تسلسل پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی کتاب ''پاکستانی کلچر'' میں تہذیب و ثقافت کو ایک ہی مفہوم میں شامل کرتے ہیں اور اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ کلچر دراصل زندگی کی ساری سرگرمیوں کو خواہ وہ ذہنی ہوں یا جسمانی، سب کا احاطہ کر لیتا ہے۔[۲]

اس طرح ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک کلچر جن چیزوں سے عبارت ہے وہ یہ ہیں:

> ''(۱) رہنے سہنے کے طریقے (۲) کھانے پینے کے آداب (۳) میل جول کے آداب و ادب کے رسوم، وضع داری، قرابت داری وغیرہ (۴) رسوم و رواج، شادی بیاہ، میلے تہوار (۵) ورزشیں، خصوصی اجتماعی شوق اور مجلسی تفریحات (۶) دیگر ذوقی مشاغل بزم آرائی (محافلِ موسیقی و شعر گوئی)، مصوری، شکار، کھیل، پرندوں کی تربیت، آرائش اور زیبائش (۷) اور مذکورہ بالا کے اہتمام و انصرام کے ذرائع جنہیں فنونِ لطیفہ اور فنونِ مفیدہ (صناعات) کی صورت میں انجام دیا جاتا ہے۔''[۳]

بہر حال ثقافت کا بنیادی پہلو مشترک رویہ ہے۔ یہ رویہ اور طرزِ عمل چونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے اجتماعی ہوتا ہے اس لیے یہ مشترک رویہ ثقافتی وصف کا درجہ رکھتا ہے۔ مثلاً مغربی معاشرے میں عورت کو دیکھتے ہی ہیٹ سر سے اُٹھا کر تعظیم دینا مغربی سوسائٹی کا ثقافتی وصف کہلائے گا۔

انفرادی عمل اور رویہ ثقافتی وصف کا درجہ نہیں رکھتے اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی توضیح نہایت مناسب ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''(طرزِ عمل کو) کلچر کے ذیل میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اظہار معاشرے کے مختلف گروہوں، طبقوں اور افراد میں باضابطگی کے ساتھ یکساں طور پر ہونا چاہیے۔ مثلاً جب میں گھر سے باہر جاتا ہوں تو دایاں پیر پہلے باہر رکھتا ہوں یہ میرا انفرادی عمل ہے لیکن اگر معاشرے کے افراد عام طور پر گھر جانے سے باہر جاتے وقت نیک شگون کے طور پر دایاں پیر پہلے باہر رکھنے لگیں تو اس عمل میں افراد کے طرزِ عمل میں باضابطگی پیدا ہو جائے گی اور یہ کلچر کے ذیل میں شمار ہوگا۔'' [۴]

اسی طرح گھر کے بزرگوں کا اپنے چھوٹوں کو جوتی گھسیٹ کر چلنے سے منع کرنا دونوں وقت ملتے ہوئے چھت پر کھڑے ہونے سے روکنا، کسی شخص کو ملتے ہوئے السلام علیکم کہنا، شادی بیاہ کی رسوم، آرسی مصحف، مہندی، رخصتی، ولیمہ وغیرہ سب ایک مخصوص معاشرے کے ثقافتی پہلو کہلائیں گے۔

اس بات کو Robert Bierstedt نے اپنی کتاب Social Order میں یوں بیان کیا ہے:

> ''دنیا کے اندر رہنے والے تمام لوگ ایک ہی چاند کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن پیورٹن نیوانگلینڈ کی مائیں اپنے بچوں کو بتاتی ہیں دیکھو چاند میں ایک بڑے کانوں والی بدروح کی شکل نظر آرہی ہے جس کے ناک پر ایک بڑا سا مسّا ہے اور جس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی قینچی ہے جس سے وہ ان بچوں کی ناک کاٹ ڈالتی ہے جو ماں باپ کا کہنا نہیں مانتے، لیکن آئرش لڑکی جب سفید شراب اور گلاب کا عرق پی کر ایک باریک ریشمی رومال کی اوٹ سے چاند کی طرف دیکھتی ہے تو اسے اپنے ہونے والے دولہا کا چہرہ نظر آتا ہے۔'

'برصغیر کی مسلم ثقافت میں چاند کے اندر چرخہ کاتنے والی بڑھیا تو کافی شہرت رکھتی ہے۔''[۵]

بنیادی طور پر ثقافت کسی بھی انسان کا وہ مکمل سماجی ورثہ ہوتا ہے جو اسے معاشرے کا فرد ہونے کی حیثیت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس مکمل سماجی ورثے میں تمام عقائد، اقدار، قوانین اور رسم و رواج شامل ہوتے ہیں۔ ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے ثقافت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''کلچر (Culture) جرمن زبان کے لفظ کلٹور سے ماخوذ ہے جس میں جوتنے بونے اور اُگانے کا استعارہ پایا جاتا ہے مگر جو کچھ جوتا جاتا ہے وہ زمین نہیں انفرادی اور اجتماعی ذہن ہے جو کچھ بویا جاتا ہے بیج نہیں تصورات ہیں اور جو کچھ اگایا جاتا ہے وہ اناج کی فصل نہیں بلکہ یکسانی کردار کا وہ نمونہ ہے جس کی بدولت کسی گروہ میں وحدت کا شعور واضح ہوتا ہے۔''[۶]

ثقافت کی مزید وضاحت کے لیے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی رائے کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے کشاف تنقیدی اصطلاحات میں کچھ یوں نقل کی ہے:

''ثقافت اکتسابی طرزِعمل کا نام ہے۔ اکتسابی طرزِعمل میں ہماری وہ تمام عادات، افعال، خیالات اور اقدار شامل ہیں جنہیں ہم ایک منظّم معاشرے یا گروہ یا خاندان کے رکن کی حیثیت سے عزیز رکھتے ہیں یا ان پر عمل کرتے ہیں یا ان پر عمل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔''[۷]

ثقافت کے حوالے سے یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ کوئی وہبی یا جبلی چیز نہیں بلکہ خالصتاً اکتسابی عمل ہے وہ اکتساب کہ جو ہم کسی معاشرے میں رہتے ہوئے اس معاشرے کے رسوم و رواج اور طور طریقوں کو اپنا کر، کرتے ہیں۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ ہمیں کسی معاشرے میں روزمرہ کی زندگی گزارتے ہوئے احساس تک نہیں ہوتا کہ ہم نے ثقافت کا باقاعدہ اکتساب کیا ہے۔

کسی بھی زبان و ادب کا مطالعہ اس کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ ادب کا تہذیبی و ثقافتی locale اس کی تفہیم میں بہت مدد دیتا ہے لیکن اس پس منظر کی اساس بھی دو چیزوں پر استوار ہوتی ہے۔ پہلی سطح یا پہلی چیز دھرتی کی تاریخ کا آئینہ ہے۔ کوئی بھی دھرتی اپنے اصلی باشندوں اور باہر سے آنے والے قبائل کی باہم

آمیزش سے اپنے لیے ایک خاص رنگ، مزاج اور موسم کا چناؤ کرتی ہے۔ دوسری چیز داخلی اور تہذیبی تصادم ہے جو زمین کے علاوہ آسمان کے اوصاف کو بھی پیش کرتی ہے اور اس طرح ان دونوں سطحوں کے امتزاج سے ہی کسی ملک کا وہ ثقافتی اور تہذیبی پس منظر مرتب ہوتا ہے جو اس کی زبان اور ادب وشعر کو متاثر کرتا ہے۔

اُردو ادب نے جس دھرتی میں جنم لیا اس کا ایک خاص ذائقہ، باس اور رنگ ہے اور اس کے پیکر کی تشکیل میں تہذیب اور رواج، زرعی نظام، موسم اور مٹی کی تاثیر کا بھی ہاتھ ہے۔

اُردو ادب اور تہذیب وثقافت کا آپس میں تعلق بے حد گہرا ہے۔ اُردو ادب میں بے شمار ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ جہاں تخلیق کار نے اپنی ثقافت اور تہذیب کو اپنی تخلیق میں موثر انداز میں اُجاگر کیا ہے۔ تخلیق کاروں کی اس کوشش سے پہلے ہمیں برصغیر پاک وہند کی صدیوں پر محیط تہذیب وثقافت کو داد دینا ہوگی کہ جس میں از خود اتنی گہرائی اور پختگی موجود ہے جس نے اس خطے کے تخلیق کار کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی تخلیق میں مختلف ثقافتی مظاہر اور معاشرتی روایات کو نمایاں جگہ دے۔ اُردو ادب کے مطالعے میں ثقافتی یا تہذیبی پہلو کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے عمرانی دبستان، تخلیق کو سمجھنے کے لیے تخلیق کار کے زمانے کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کو بنیادی اہمیت دیتا ہے یا نفسیاتی دبستان، تخلیق سے زیادہ تخلیق کار کے لاشعور کو اہم تصور کرتا ہے ٹھیک اسی طرح ضرورت اس بات کی ہے کہ تہذیب اور ثقافت کے ان مٹ نقوش کے تناظر میں تخلیق کار کی تخلیق کا مطالعہ کیا جائے۔ اس صورت میں ہمارے سامنے بے شمار ایسی مثالیں ہیں کہ جہاں ادیب اپنی تہذیب وثقافت کے رنگ میں رنگا دکھائی دیتا ہے۔

برصغیر پاک وہند کی سرزمین اس پس منظر میں حد درجہ زرخیز ہے کہ یہاں کی تہذیب وثقافت صدیوں پرانی اور نہایت جاندار اور تاثریت سے لبریز ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید کی رائے خاصی اہمیت کی حامل ہے:

> ''برصغیر پاک وہند ارض عالم کا ایک ایسا پراسرار خطہ ہے جہاں فطرت نے اپنے بوقلموں رنگ بڑی فیاضی سے بکھیرے ہیں۔ دریاؤں، میدانوں، جنگلوں اور پہاڑوں کی یہ سرزمین دنیا کی ایک نہایت قدیم تہذیب کا گہوارہ ہے۔ چنانچہ جب یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور یونان میں تہذیب کا چراغ ابھی روشن نہیں ہوا تھا، برصغیر تہذیبی اعتبار سے مقام عروج پر پہنچ چکا تھا۔'' [۸]

ڈاکٹر انور سدید کی مندرجہ بالا رائے کی روشنی میں یہ بات خاصی واضح ہوتی ہے کہ اس خطے کے ادیبوں کے ہاں شعوری سطح پر یا لاشعوری طور پر اپنی ثقافت اور تہذیب کی جو جھلک دیکھنے کو ملتی ہے، وہ بہت حد تک اس سرزمین ہی

کی مرہون منت ہے۔درحقیقت برصغیر کی تہذیب وثقافت نہ صرف ماضی میں بلکہ موجودہ دَور میں بھی اس قدر بھرپور اور جامع ہے کہ آج کا ادیب اس تہذیب وثقافت کی نمائندگی کے بغیر اپنی تخلیق کو نامکمل تصور کرتا ہے۔ارضی ثقافتی تحریک ادیبوں کے ہاں ثقافت کی نمائندگی کے تناظر میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے نزدیک:

> ''ارضی ثقافتی تحریک کی نظریاتی اساس ڈاکٹر وزیر آغا کے تفکر کا نتیجہ ہے۔ان کا اساسی موقف یہ ہے کہ ثقافت زمین اور آسمان کے تصادم سے جنم لیتی ہے۔۔۔۔تنقید میں ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب ''اُردو شاعری کا مزاج'' اس تحریک کی نظریاتی بوطیقا ہے۔''[۹]

ثقافت کے اس تعارف کے بعد ذیل میں ہم اُردو کے نمائندہ یا نسبتاً معروف ادب میں برصغیر پاک وہند کی ثقافت کی نمایاں جھلک تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

اُردو کے منظوم قصے تہذیبی اور تاریخی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔اُردو شعر وادب کی ترقی کا اولین مرکز دکن ہے۔قطب شاہی اور عادل شاہی حکمرانوں نے اُردو شاعری کو فروغ دینے میں عملی حصہ لیا ہے۔یوں تو پورا دکنی ادب اپنے دَور کی خوش حالی اور فارغ البالی کی نمائندگی کرتا ہے لیکن اس زمانے کے عام ذہنی رجحانات کا اندازہ غزل، رباعی، قصیدہ اور مرثیہ سے نہیں بلکہ منظوم داستانوں سے ہوگا جو قطب مشتری، سیف الملوک و بدیع الجمال، پھول بن، من لگن، خاوند نامہ اور یوسف زلیخا کے نام سے وہاں کے ادب میں ملتی ہیں۔ان داستانوں میں گولکنڈہ اور بیجاپور کے حکمرانوں کی ساری تہذیبی تاریخ محفوظ ہے اور ان کے مطالعے کے بغیر اس دَور کے عام ادبی مذاق ور جحانات اور ان کے عوامل ومحرکات کا سمجھنا مشکل ہے۔

اسی طرح قدیم دہلی کی جیتی جاگتی تصویر، سودا ومیر کے قصائد کے علاوہ میر حسن کی سحر البیان میں ملے گی لکھنوی تہذیب۔اس کے علاوہ تکلفات ولوازمات کا اندازہ آتش وناسخ کی غزلوں کے ساتھ سعادت یار خان کی مثنوی دلپذیر دیا شنکر نسیم کی گلزارِ نسیم اور شوق کی زہرِ عشق وفریبِ عشق سے ہوگا۔

اُردو شاعری میں روحِ عصر کی تلاش کرنی ہے تو وہ غزلوں سے زیادہ اور قصائد سے زیادہ منظوم داستانوں میں ملے گی۔دکن، دہلی، فیض آباد، لکھنؤ، مرشد آباد اور رام پور کے نوابوں کا ٹھاٹ باٹ۔ان کے درباروں کی شان و شوکت، ان کے حرم خانوں کی چہل پہل کی ثقافتی جھلکیاں منظوم داستانوں میں ہی مل سکتی ہیں۔اس سلسلے میں میر حسن

کی مثنوی ''سحر البیان'' کو دیکھیں۔ سحر البیان کے قصے میں جس بادشاہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ اپنی عادات واطوار و خصائل سے اٹھارویں صدی عیسوی کا ایک مسلمان حکمران ہے۔ جب دلّی اور لکھنؤ سیاسی زوال کا شکار ہوئے تو مسلمان زورِ بازو سے زیادہ قسمت پر بھروسہ کر کے بیٹھ گئے۔ وہ صرف توہم پرستی کے سہارے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسلامی تہذیب وثقافت سے زیادہ وہ مقامی آب ورنگ سے متاثر تھے اور ان کی عملی زندگی دراصل مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی معاشرت کے زیرِ اثر تھی۔ لکھنؤ کے نوابین کی زندگی خصوصاً یہ ہی تھی۔ اٹھارویں صدی کے مسلمان بادشاہ یا نوابین جس مخلوط ہندی مسلم کلچر کو فروغ دے رہے تھے، میر حسن نے اپنے قصے میں ان کو بیان کیا ہے۔ شادی بیاہ، لباس، خوراک، سیر وتفریح سب میں ہندوانہ اثرات غالب تھے۔ مثلاً

کیا پنڈتوں نے جو اپنا بچار   تو کچھ انگلیوں پر کیا پھر شمار
جنم پترا شاہ کا دیکھ کر   تلا اور برچھیک پہ کر نظر
کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا   چندر ماں سا بالک ترے ہوئے گا

اسی طرح خادماؤں اور خواصوں کی چہل پہل کا نقشہ بھی میر حسن نے اس دور کے ماحول اور معاشرت و ثقافت کے اہم پہلوؤں کو ذہن میں رکھ کر کھینچا ہے۔

ددا ، دائیاں اور مغلانیاں   پھریں ہر طرف آتیاں ، جاتیاں
خواصوں کا اور لونڈیوں کا ہجوم   محل کی وہ چہلیں وہ آپس کی دھوم
تکلف سے پہنے پھریں سب لباس   رہیں رات دن شہزادے کے پاس
کوئی آرسی اپنے آگے دھرے   ادا سے کہیں بیٹھی کنگھا کرے

تخلیقی نثر کا جو اہم ترین اُسلوب اُردو کی ادبی روایت کے آغاز میں شاعری کے بعد ہمارے سامنے آیا وہ داستانوی نثر کا ہے۔ داستان اور کہانی صرف ایک زوال آمادہ تمدن کی یادگار ہی نہیں ایک مخصوص طرز احساس کے سیاق وسباق میں نسل انسانی کے تجربات اور تہذیبی زندگی کے مختلف سانچوں کا استعارہ بھی تھی اور واقعات اور کرداروں کے پیچھے تصورات کی بہت سی صورتیں مل کر معاشرتی اور روحانی تربیت کے ایک باطنی نظام کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

یہ داستانیں جہاں ایک مخصوص معاشرے کی معاشرت طرزِ زندگی اور تہذیب وثقافت کی جھلکیاں اپنے اندر رکھتی ہیں وہیں پر اس زمانے کے معاشرے کی زبان ومحاورہ کی خوبی سے بھی مالا مال ہیں۔ ایسے سینکڑوں محاورے اور

الفاظ ملتے ہیں جو آج کل متروک ہوگئے ہیں لیکن داستانوں میں وہ اپنی بہار اسی طور پر دکھاتے ہیں کہ اس زمانے کی مخصوص طرزِ معاشرت وثقافت کی چاشنی پھر سے محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً باغ و بہار میں ایک بڑھیا کی دعا اور گفتگو دیکھئے:

''الٰہی تیری نتھ چوڑی سہاگ کی سلامت رہے اور کماؤ کی پگڑی قائم رہے۔ میں غریب رنڈیا فقیرنی ہوں ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دو جی سے پورے دنوں دردزہ سے مرتی ہے اور مجھ کو اتنی وسعت نہیں کہ ادھی کا تیل چراغ میں جلاؤں۔ کھانے پینے کو کہاں سے لاؤں۔ اگر مرگئی تو گورو کفن کیوں کر کروں گی اور جیے تو دائی جنائی کا کیا دوں گی اور بچہ کو سٹھوارا اچھوانی کہاں سے پلاؤں گی۔ آج دو دن ہوئے ہیں کہ بھوکی پیاسی پڑی ہے اے صاحب زادی اپنی خیر کچھ ٹکڑا پارچہ دلاؤ تو اس کو پانی پینے کا ادھار ہو۔''

باغ و بہار میں بحیثیت مجموعی زندگی کی ایک لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ ایک مخصوص معاشرت اور ایک مخصوص تہذیب وثقافت میں پروان چڑھتے ہوئے انسان رواں دواں اور بولتے چالتے دکھائی اور سنائی دیتے ہیں۔

برصغیر کی تہذیب وثقافت کے پس منظر میں جہاں بہنوں کا بھائی کے لیے پیار اور جانثاری کا جذبہ بھی اُردو ادب کے لیے ایک خاص کشش کا باعث ہے وہاں بھائیوں کے لیے بہنوں کے گھر سے کچھ کھانا یا رہائش اختیار کرنا ایک معیوب بات تصور کی جاتی ہے۔ باغ و بہار میں یہ تہذیبی وثقافتی رویہ ملاحظہ ہو:

''اے بیرن! تو میری آنکھ کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا لیکن خدا نے مردوں کو کمانے کے لیے بنایا ہے۔ گھر میں بیٹھے رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں خصوصاً اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے تمہارے رہنے پر کہیں گے اپنے باپ کی دولت کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آپڑا ہے۔ یہ نہایت بے عزتی میری کی بات بنائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال کر رکھوں۔''

داستانی روایت کے تسلسل میں جتنے بھی قصے تحریر کیے گئے اس سے قطع نظر کہ وہ طبع زاد تھے یا نہیں ان میں جو خصوصیت قدرِ مشترک کے طور پر نمایاں ہے۔ وہ یہی ہے کہ اِن میں سب ادب آداب رسم ورواج اور رہن سہن کے سلیقے پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، قصوں اور کہانیوں میں معاشرتی زندگی کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں ہے جس کی عکاسی ان میں نہ ملتی ہو۔

خاندان میں مرد کی مثبت حاکمیت مشرقی روایات اور ثقافت کا ایک اہم پہلو ہے۔ مثبت حاکمیت سے مراد وہ ذمہ داریاں لی جاسکتی ہیں کہ جن کو سرانجام دے کر مرد اپنے کنبے کا صحیح معنوں میں سربراہ بنتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں کسی خاندان یا کنبے کا سربراہ کسی عورت کا ہونا خال خال ہے اور یہ بھی محض ان صورتوں میں دیکھنے کو ملتا ہے کہ جہاں کسی وجہ سے مرد کا وجود نہ ہو۔ مرد کی موجودگی میں عورت کی حاکمیت ہماری روایات اور ثقافت کے منافی ہے۔ اس پس منظر میں پریم چند کا مشہور ومعروف ناول گئودان بطور مثال لیا جاسکتا ہے۔ ناول کا ایک کردار ہیرا اپنے بانسوں کا سودا گاؤں کے چوہدری سے کرتا ہے مگر اس سودے سے ہیرا کی بیوی پنیا خوش نہیں ہوتی اور جب چوہدری بانس کاٹنے لگتا ہے تو پنیا اس کے مقابل آکھڑی ہوتی ہے، نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچتی ہے اس جھگڑے کی خبر جب ہیرا کو ملتی ہے تو اس کا ذہنی ہیجان کچھ ان الفاظ میں ہمارے سامنے آتا ہے:

> ''ہیرا کو بھی خبر ملی کہ چوہدری اور پنیا میں جنگ ہورہی ہے چوہدری نے پنیا کو دھکا دیا اور پنیا نے اُسے جوتی سے پیٹا۔۔۔۔ اُسے چوہدری پر غصہ نہ تھا بلکہ غصہ تھا پنیا پر۔ وہ کیوں چوہدری سے لڑی؟ کیوں اس کی عزت مٹی میں ملا دی؟ بانس والے سے جھگڑنے سے اُسے کیا مطلب؟ اُسے جا کر ہیرا سے کل ماجرا بیان کر دینا چاہیے تھا وہ جیسا مناسب سمجھتا کرتا۔ وہ اس سے لڑنے کیوں گئی۔'' [۱۰]

پریم چند نے ہیرا اور پنیا کی صورت میں مشرقی ثقافت کی خوب صورت تصویر کشی کی ہے کہ جہاں مرد اور عورت کی ذمہ داریاں جدا جدا ہیں۔ مرد گھر سے باہر کا ذمہ دار ہے جب کہ عورت گھر کی چار دیواری میں رہتے ہوئے مختلف امور سرانجام دیتی ہے۔ مرد یا عورت میں سے جو کوئی اپنی ذمہ داریوں سے بڑھنے کی کوشش کرے گا تو یہ طرزِ عمل مشرقی روایات وثقافت کے برعکس ہوگا۔

ماں کا اپنی اولاد سے پیار محبت مشرقی روایت وثقافت کا حسن ہے۔ اس خطے کی ماں کے نزدیک اس کی اولاد

سب سے بڑھ کر ہے۔ اپنی اولاد کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جانے والی ماں مشرقی ثقافت میں اہم مقام کی حامل ہے۔ اپنے خون سے محبت کا یہ عالم ہے کہ بچے بڑے سے بڑا گناہ بھی کر دیں اتنا بڑا گناہ کہ انہیں بھری دنیا میں کوئی اپنانے کو تیار نہ ہو مگر اس وقت بھی یہ ماں ہی ہوگی کہ جو سب خطائیں جاننے کے باوجود اپنی اولاد کو آغوش میں بھر لے گی۔ ماں کے اس مثالی کردار کی بے شمار مثالیں اُردو ادب میں موجود ہیں تاہم یہاں ہم مرزا رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' کو لیں گے۔

ناول کی ہیروئن امراؤ حادثاتی طور پر طوائف بن جانے کے کافی عرصے بعد جب اپنے وطن فیض آباد جا پہنچتی ہے تو اس کا ایک ایک پل اپنی ماں کی یاد میں گزرتا ہے۔ سوچتی ہے کہ اس شہر میں اس کی ماں بھی موجود ہے۔ ادھر ماں کے دل میں بھی اپنے خون کی تڑپ بیدار ہوتی ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ امراؤ ان کی عزت کی قاتل اور رسوائی کی ذمہ دار ہے، پھر بھی اُسے گلے لگاتی ہے:

> ''ہائے میری امیرن کہہ کے لپٹ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں چیخیں مار مار کے رونے لگیں، ہچکیاں بندھ گئیں۔ آخر دو عورتوں نے آ کر چھڑایا۔۔۔۔ ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا تھا وہ نگاہ مرتے دم تک مجھے نہ بھولے گی۔''[۱۱]

شادی بیاہ کے موقع پر بَر دکھانے کے لیے اہتمام کیا جاتا ہے۔ طرفین والے جب آپس میں شادی کا تصفیہ کر لیتے ہیں تو ایک خاص تاریخ مقرر کی جاتی ہے اور لڑکے والے لڑکی والوں کے یہاں آتے ہیں پھر اس کے بعد لڑکی والے لڑکے والوں کے یہاں جاتے ہیں اور ان کی ضیافت ہوتی ہے اور ہونے والے دولہا کو کوئی تحفہ پیش کیا جاتا ہے۔

> ''زرینہ اپنے کمرے سے برآمد ہوئیں اودا ریشمی غرارہ، پشمینے کی شال، چہرہ دلی مسرت سے جگمگا رہا تھا۔ صفیہ پر نظر پڑی ''ریڈی؟ شاباش! مگر پھر وہی بوسیدہ دوشالہ اوڑھ لیا، صفیہ کچھ تو خیال کرو، غیر آدمی داماد بننے والا ہے، کیا سوچے گا، ایسی بھی کیا خست، ایسا حلیہ نہ بناؤ کہ لوگ تم کو بالکل پیپل سے اُتری سمجھیں۔''[۱۲]

ایک گھر کا تصور مشرقی روایات اور ثقافت کا اہم جزو ہے۔ گھر کے تصور سے مراد ایک ایسا مثالی گھر ہے کہ

جہاں دن بھر کی مزدوری کے بعد انسان جائے تو کوئی اس کا انتظار کرتا ہو، ننھے بچوں کی معصوم شرارتیں سارے دن کی تکان کو لمحہ بھر میں مسرت اور راحت میں تبدیل کر دیں، ایک ایسا گھر کہ جہاں ہر فرد کو دوسرے کی فکر ہو، ہر کوئی دوسرے کے غم کو اپنا غم سمجھے اور دوسرے کی خوشی میں شریک ہو کر لطف کو دوبالا کر دے۔ اس طرح کے گھر کے بغیر مشرقی روایات اور ثقافت کو مکمل خیال نہیں کیا جا سکتا۔ گھر کے اس مسرت انگیز خیال یا تصویر میں جب دراڑ پڑتی نظر آئے تو اسے ٹوٹنے سے بچانے کی خاطر گھر کا کوئی بھی فرد کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ خیالستان (از سجاد حیدر یلدرم) کے افسانے ''نکاح ثانی'' میں ہمیں ایک ایسی ہی بیوی دیکھنے کو ملتی ہے کہ جس کا شوہر ایک طوائف کی زلفوں کا اسیر ہو چکا ہے۔ ان میاں بیوی کی ایک بیٹی بھی ہے جو رات بھر اپنے باپ کا انتظار کرتی ہے مگر باپ اپنے جنت جیسے گھر آنے کی بجائے طوائف کے کوٹھے پر سکون تلاش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس شخص کی بیوی مشرقی ثقافت کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے گھر کو بچانے کی خاطر انتہائی قدم اُٹھانے پر مجبور ہو جاتی ہے اور وہ طوائف کے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ جاتی ہے۔ ایک حیادار بی بی کی طوائف کے سامنے کی گئی التجا بہت حد تک واضح کرتی ہے کہ مشرق میں ایک گھر کا کیا تصور ہے:

> ''میں تم سے اپنا خاوند چھیننے نہیں آئی کیونکہ اپنے میں اس کی نہ قابلیت، نہ طاقت پاتی ہوں، میں تو اسے مانگنے آئی ہوں۔ ایک گھر کا چین، ایک خاندان کا آرام تمہاری ہتھیلی میں ہے۔۔۔۔ وہ میرا شوہر ہے، اسے صرف میرا ہو کے رہنا چاہیے۔ میرے سوا اس پر کسی کا حق نہیں، میرے سوا وہ کسی کی ملکیت نہیں، کسی کی امانت نہیں۔۔۔۔ ہاں سنتی ہو، میرے پاس پانچ برس کی ایک ننھی بھولی جان بھی ہے وہ بھی رو رو کے بابا کا انتظار کر کے سوتی ہے۔ تمہیں خبر نہیں کہ گھر میں یہ کیفیت کیسی مصیبت کی کیفیت ہے۔''[۱۳]

نثر نگاروں کے ہمراہ اگر شاعری میں اُن شعراء کا جائزہ لیا جائے کہ جو اپنی تخلیقات میں ثقافت اور عوامی روایات کا بھرپور اظہار کرتے رہے ہیں تو ایسے حضرات کی فہرست خاصی طویل ہوگی۔ تاہم بطور خاص ہم یہاں مشہور شاعر نظیر اکبر آبادی کو لے سکتے ہیں۔ نظیر اٹھارویں صدی کے وسط میں پیدا ہوئے، ساری عمر آگرہ اور اس کے گرد و نواح میں ایک پیشہ ور معلم کی زندگی بسر

کی۔ان کی زندگی میں آگرہ کو، وہاں کے تربوز، ککڑی، موسموں، میلوں، مذہبی
تہواروں غرض کہ ذرے ذرے کو بنیادی اہمیت حاصل رہی اور اس کا اظہار ان
کی شاعری میں جابجا ملتا ہے۔

نظیر اکبرآبادی کے ہاں ثقافت کی نمائندگی کے حوالے سے خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے بلاتفریق ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی ثقافت اور روایات کو اپنی شاعری کی زینت بنایا۔ذکر چاہے ہولی کا ہو یا شب برات کا، موقعہ دیوالی کا ہو یا عید کا نظیر نے ثقافت کے ان تمام پہلوؤں کو نہایت خوب صورتی سے اپنی شاعری میں سمودیا ہے۔اس پس منظر میں نظیر کی شاعری سے چند ایک مثالیں درج ذیل ہیں:

آ کر کسی کے سر پر چھچھوندر لگی کڑی   اوپر سے اور ہوائی کی آ کر پڑی چھڑی
ہو گئی گلے کا ہار پٹاخے کی ہر لڑی   پاؤں سے لپٹی شور مچا کر قلم تڑی
کرتی ہے پھر ایسی ستم گاری شب برات   (شب برات)

ہر اک مکاں میں جلا پھر دیا دوالی کا   ہر اک طرف کو اُجالا ہوا دوالی کا
سبھی کے دل میں سماں چھا گیا دوالی کا   کسی کے دل کو مزا خوش لگا دوالی کا
عجب بہار کا ہے دن بنا دوالی کا   (دیوالی)

پاربتی کی شادی کی تصویر کشی کرتے ہوئے نظیر اکبرآبادی نے مٹھائیوں کا خوب ذکر کیا ہے۔واضح رہے کہ مشرقی روایات وثقافت میں مٹھائی کے بغیر کسی خوشی کا تصور محال ہے۔کہتے ہیں:

انبار لگائے پیڑوں کے اور ڈھیر گلابی اور برفی
پھر لڈو بھی تیار کیے قند بست بادام گری
براق مگندر اور خرمے بھی خوب رنگ امرتی بیربلی
وہ خوب جلیبی اور کھجلے وہ گھیور بالوساہی بھی

مندرجہ بالا چند ایک مثالوں سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ نظیر کی شاعری میں ثقافت اور عوامی روایات کی کس قدر اہمیت اور مقام تھا۔ یہاں فراق گورکھ پوری کی رائے کا ذکر مناسب ہوگا۔فراق گورکھ پوری کی یہ رائے پروفیسر قمر رئیس نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''اُردو میں لوک ادب'' میں کچھ یوں نقل کی ہے:

''نظیر اکبرآبادی مقامی تہذیب وثقافت میں رنگ گئے تھے۔ہندو تہواروں میں

بہت دلچسپی لینے لگے تھے اور دل و جان سے لطف اُٹھاتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا کہ ہندو اور مسلمان میں کوئی بیگانگی نہ تھی۔''[۱۴]

اُردو کی ادبی روایت کا آغاز شعر کی شکل میں ہوا اور یہ شعر برصغیر کی تمام ثقافتی اور تہذیبی عناصر کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ شعر کا مزاج دراصل دھرتی کے مزاج سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ اگرچہ اُردو شاعری میں غزل اور نظم کے علاوہ بے شمار اصنافِ شعر رائج ہیں لیکن بنیادی حیثیت ان دونوں کو ہی حاصل ہے۔

اُردو شاعری کے ابتدائی دَور میں گیت ایسی صنف سخن تھی جس نے ثقافت کے ہر رنگ کو اپنے اندر سمویا۔ گیت کا امتیازی وصف یہ ہے کہ یہ ماں زمین یا معاشرے کے بطن میں پیدا ہونے والی کروٹ کا علم بردار ہے۔[۱۵]

ثقافتی لحاظ سے گیت کا نہایت گہرا تعلق زمین سے ہے۔ گیت کے سلسلے میں حفیظ، ساغر اور تاثیر کے بعد اگلا اہم نام میرا جی کا ہے۔ میرا جی کے ہاں دھرتی پوجا کے رجحانات کی فراوانی ہے۔ میرا جی کا قدیم ہندو تہذیب سے تعلق خاطر، ہندوستان کی دھرتی اور اس کے مظاہر مثلاً جنگلوں، درختوں، دریاؤں، پرندوں، پھولوں اور غاروں سے ایک گہری وابستگی نے میرا جی کو ایسے گیتوں پر اُکسایا ہے جن میں ہندوستان کی دھرتی کی سوندھی باس موجود ہے۔ ہندی گیت کی مخصوص گھلاوٹ اور رچاؤ، فضا کا سارا دلکش ترنم میرا جی کے گیتوں میں موجود ہے۔

چھم چھم چھم چھم ناچ رہی ہے
موہن دھرتی کر کے سنگار
دل میں کیسی پکار
ہنسی رات میں کسانے بجائی
رام دہائی! رام دہائی
راکھ میں چنگاری کیوں سلگی
اس کی نہیں ہے تاب
ہمارے
دھندلے پڑ گئے خواب

قدیم و جدید ادب سے یہ چند مثالیں مشتے از خروارے پیش کی گئی ہیں۔ ادب کی خواندگی کے جدید انداز اور سلیقے کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاید ہی کسی تخلیق کار نے اپنی تہذیبی وثقافتی روایت سے الگ ہو کر لکھا ہو۔

ادب اور ادیبوں کے بارے میں تصوراتی، تخیلاتی اور ماورائی دنیاؤں میں بسے رہنے اور انہیں دنیاؤں کی تصویریں تخلیق کرنے کے الزام باطل دکھائی دیتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ فاروق عثمان، ڈاکٹر: ''اُردو ناول میں مسلم ثقافت''، بیکن بکس، ملتان، باراول ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۔

۲۔ جمیل جالبی ڈاکٹر: ''پاکستانی کلچر''، فضل سنز کراچی ۱۹۸۵، ص ۴۲۔

۳۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: ''کلچر کا مسئلہ''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۹۔

۴۔ جمیل جالبی ڈاکٹر: ''پاکستانی کلچر''، ص ۴۲۔

۵۔ بحوالہ فاروق عثمان، ڈاکٹر: ''اُردو ناول میں مسلم ثقافت''، ص ۴۸۔

۶۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص: ۵۴۔

۷۔ // // ص: ۵۵۔

۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اُردو ادب کی تحریکیں''، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص: ۶۲۱-۶۲۲۔

۹۔ // // ص: ۶۱۴۔

۱۰۔ پریم چند، ''گئودان''، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، س۔ن، ص: ۳۵۔

۱۱۔ مرزا ہادی رُسوا، ''امراؤ جان ادا''، تخلیقات، لاہور، فروری ۱۹۹۵ء، ص: ۱۵۳۔

۱۲۔ قرۃ العین حیدر: ''چاندنی بیگم''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۴۰۳۔

۱۳۔ سجاد حیدر یلدرم، ''خیالستان''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۲۵-۱۲۶۔

۱۴۔ قمر رئیس، پروفیسر (مرتبہ)، ''اُردو میں لوک ادب''، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، جنوری ۱۹۹۰ء، ص: ۲۳۶۔

۱۵۔ وزیر آغا ڈاکٹر: ''اُردو شاعری کا مزاج'' جدید ناشرین چوک اُردو بازار لاہور، مئی ۱۹۶۵ء ص ۱۷۱-۱۷۲۔

☆☆☆